منور مقبول عثمانی*

صاحبِ اسلوب یا صاحبِ اسالیب؟
(اسالیبِ نثر کے تناظر میں ایک سوال کا تجزیہ)

Abstract:

Man of Style or Man of Styles? (An Analysis of Point in Context of Prose Styles)

A pertinent question in the critique of prose style is whether a writer has one style or more. This paper attempts to address this concern in the context of Urdu prose. The central idea is that a writer has diverse features to his 'style' and that on some level, these features may be categorized as different styles on their own.

Keywords: Urdu Prose, Writing Style, Literary Criticism, Urdu Stylistics.

مطالعۂ اسلوب یا تنقید اسلوب کی بحث جب آگے بڑھتی ہے تو ایک سوال پوری شدت سے ابھرتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی صاحبِ اسلوب ادیب یا شاعر ''صاحبِ اسالیب'' بھی ہو؟ یعنی اُس کا کوئی ایک منفرد، متعین اور مشخص اسلوب نہ ہو بلکہ وہ کئی ''اسالیب'' کا مالک و مختار ہو؟ اِس سوال کے اُبھرنے (یا اِس حوالے سے کنفیوژن [confusion] پھیلنے) کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہر بڑے تخلیق کار کے اسلوب میں تنوع اور رنگا رنگی کی کیفیت ہوتی ہے، وہ ایک پھول کے مضموں کو کئی رنگوں سے باندھتا ہے لیکن یہ سب رنگ اس کے بنیادی اسلوب کے آئینے کی مرتعش صورتوں ہی سے پھوٹ رہے ہوتے ہیں، اس سوال کے ابھرنے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلوب ایک مرکب چیز ہے جو کئی اجزا کو اپنے بطون میں سمیٹے ہوتا ہے اور اجزائے زبان و بیان ہی نہیں، اجزائے موضوع و مواد بھی اسلوب کی باطنی شخصیت کا حصہ بنے ہوتے ہیں لیکن ہمارے کچھ ناقدین، اسلوب پر بحث کرتے ہوئے اسلوب کے اجزا کو ''اسالیب'' قرار دے دیتے ہیں؛ مثلاً ہندوستان کے طارق سعید (پ: ۱۹۵۵ء) نے

اجزائے زبان و بیان (محاورہ، قافیہ، سجع، ترصیع، رنگینی، اِستعارہ، علامت وغیرہ) اور اجزائے موضوع و مواد (مذہب، فلسفہ، حکمت، اِسی طرح تخیل کی کارفرمائی، خیال کے بکھراؤ یا طنز وظرافت کی فراوانی وغیرہ) کو اسالیب قرار دے کر اپنی کتاب اسلوب اور اسلوبیات (۱۹۹۶ء) میں باقاعدہ فہرستیں اور نقشے مرتب کر ڈالے ہیں۔ (اس کی تفصیل آگے آئے گی)

اس حوالے سے دیگر ناقدین کو بھی تسامح ہوا ہے اور انھوں نے کچھ نثر نگاروں کو صاحب اسلوب کے بجائے صاحب اسالیب قرار دیا ہے، کچھ ناقدین کے ہاں تضاد بیانی ہے، کبھی وہ کسی نثر نگار کے اسلوب واحد کی خبر دیتے ہیں اور کبھی اپنی تحریر کے کسی اور حصے میں اسی ادیب کو کئی اسالیب کا مالک کہہ دیتے ہیں۔

ایک زندہ اسلوب کی ایک خصوصیت اس کا لچکیلا ہونا بھی ہے، سو لچک کے باعث پیرایۂ بیان متحرک اور متغیر رہتا ہے؛ اس کیفیت کو جمیل جالبی (۱۹۲۷ء-۲۰۱۹ء) کے موزون و مناسب الفاظ میں ''موضوع کی مناسبت سے طرزِ ادا میں تبدیلی'' بھی کہا جا سکتا ہے[۱]۔ اصل میں اسلوب کے داخل میں ارتعاش کی کیفیت اور ارتقا پذیری کی قوت موج زن ہوتی ہے؛ یہ کیفیت اور قوت، اسلوب کی خارجی پرت سے بھی مسلسل ظاہر ہوتی رہتی ہے اور اسلوب کی باطنی جہت سے بھی، لیکن اسلوب کے خارج میں ظاہر ہونے والا یہ لسانی و بیانی تغیر ''مرکزی اسلوب'' ہی کا ایک حصہ یا رنگ یا آہنگ ہوتا ہے، اسے ایک الگ اسلوب یا مصنف کا دُوسرا یا تیسرا اسلوب نہیں کہا جا سکتا۔

اسلوب کئی رنگوں اور روشنیوں سے عبارت ہوتا ہے اور ارتقا کے عمل سے گزرتا ہے جیسا کہ شاعر یا ادیب کی فکر اور شخصیت گزرتی ہے[۲]۔ لہٰذا جس طرح ہم شاعر یا ادیب کی فکر میں تغیر کے عناصر و مظاہر دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس صاحبِ فکر شاعر یا ادیب کے کئی فکری نظام ہیں اور وہ ایک دوسرے سے متصل نہیں، ایک دوسرے کے مدّمقابل ہیں، معاون نہیں، متخالف ہیں؛ اسی طرح کسی صاحبِ اسلوب کے یہاں رنگا رنگی دیکھ کر کئی اسالیب کی موجودگی کا اعلان نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں کسی ایک مصنف کے یہاں کئی اسالیب کا اشتباہ تو ہوسکتا ہے لیکن بالعموم حقیقت میں اُس کا اسلوب ایک ہی ہوتا ہے جس کے رنگ اور ارتعاش، تنوّع اور تموّج ایک دوسرے کے معاون ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے وجود میں بہت دور تک اُترے ہوتے ہیں۔

کئی اسالیب کا شک عموماً تب گزرتا ہے جب مصنف کی تخلیقی طلب اور اظہاری ضرورت کے لیے اسلوب کا کوئی ایک رنگ تیز ہو جاتا ہے اور کوئی رنگ مدھم پڑ جاتا ہے؛ اکثر اوقات رنگوں کی تیزی یا تخفیف، مصنف کے تخلیقی مواد کے ساتھ ہی جنم لے چکی ہوتی ہے۔

اسلوبِ واحد ہی سے کسی مصنف کی ذات مجسم ہوتی ہے؛ سو عبارت میں زبان و بیان کے کچھ اجزا یا عناصر کا افراط دیکھ کر اُن اجزا یا عناصر کو ''اسالیب'' قرار دینا کسی اعتبار سے بھی موزوں نہیں۔ کچھ ناقدین نے چند نثر نگاروں کے ہاں دو یا دو سے زائد اسالیب کی جو خبر دی ہے؛ اس سے تو یہ مفہوم نکلتا ہے کہ مصنف کی کئی ذاتیں ہیں جو کئی اسالیب میں مجسم و متشخص ہو رہی ہیں۔

اسلوب میں تغیر، تلوّن اور تنوّع کی کیفیت ایک دُھوپ چھاؤں کے مانند پھیلتی اور سمٹتی ہے۔ عموماً یہ مظاہر ہر اچھے اسلوب کا لازمی حصہ ہوتے ہیں؛ بعض اوقات انھی کے باعث نثر میں دولہجوں، رنگوں، دھاروں یا دولسانی پیرایوں کی موجودگی ایک الگ ذائقہ پیدا کر دیتی ہے۔ ظاہر ہے، یہ دو لہجے، دو رنگ یا دو دھارے، دو ''اسالیب'' نہیں ہو سکتے کیوں کہ رشید حسن خان (۱۹۲۵ء۔۲۰۰۶ء) کے لفظوں میں: ''ایک شخص کا حقیقی اسلوب تو ایک ہی ہوتا ہے''[۳] سو اظہار کے مدّ و جزر اور زبان و بیان کے خفیف تغیرات (variations) کو کئی اسالیب کی کار فرمائی قرار نہیں دیا جا سکتا؛ یہ مدّوجزر اور لسانی و بیانی تغیرات تخلیقی تقاضوں اور اظہاری ضرورتوں کے مکمل ادراک اور ابلاغی جامعیت کے احساس سے از خود جنم لے لیتے ہیں۔

اصل میں صاحبِ اسلوب، زندگی کی کیمیا کو اسلوب کی کیمیا بنا دیتا ہے کہ زندگی سے پھوٹتے موضوعات و مطالب تخلیق کار کی باطنی لہروں اور ان لہروں کے اظہاری سانچوں کے ساتھ گھل مل جاتے ہیں۔ یہ اظہاری سانچا یا معرض اظہار جامد، اٹل اور بے جان نہیں ہوتا؛ یہ کسی نامیاتی وجود کی طرح موضوع، مخاطب اور ماحول کے تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے تحرک و تغیر سے بھی گزرتا ہے اور تشکیلِ نو کے عمل سے بھی ہر لمحے جڑا رہتا ہے۔

بقول وزیر آغا (۱۹۲۲ء۔۲۰۱۰ء) اسلوب کسی بھی ادبی شخصیت کے داخل و خارج کے انضمام سے اُبھرنے والا ''دستخط'' ہے، اس لفظ ''دستخط'' سے مواد و اسلوب کی یکتائی بھی ظاہر ہوتی ہے[۴] اور اسلوب کی داخلی و خارجی جہت کی یک جائی بھی[۵]۔ ہر تخلیق کار، فن کی دنیا میں فقط ایک ہی دستخط چھوڑتا ہے؛ ہر دستخط اپنے خالق کی ذات سے برآمد ہوتا ہے، سو اپنی مکمل صورت میں اس کا جنم کسی دوسرے کے یہاں ہونا، ممکن نہیں؛ علاوہ ازیں کسی تخلیقی دستخط کو کسی غیر تخلیقی منصوبے کے تابع نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی کسی عہد کے تمام تخلیق کاروں کو بقول وزیر آغا ''ایک ہی دستخط کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔''[۶]

اردو تنقید میں صاحبِ اسلوب یا صاحبِ اسالیب کی بات دیگر مباحث اسلوب کے ''زور و شور'' میں قدرے عقب میں رہی ہے، سو اس کا تجزیہ پورے طور پر نہیں ہو سکا ہے۔ مختلف وقتوں میں مختلف ناقدین، اپنے تصور اسلوب کے مطابق نہایت سہولت سے کسی کو صاحبِ اسلوب اور کسی کو صاحبِ اسالیب قرار دیتے رہے ہیں۔ اس ضمن میں پہلی مثال سید محی الدین

قادری زور(۱۹۰۵ء۔۱۹۶۲ء) کی ہے۔ انھوں نے مباحث اسلوب پر اردو میں پہلی یک موضوعی کتاب : اردو کے اسالیب بیان (۱۹۳۲ء) لکھی۔ اس کتاب میں عمومی طور پر تو محی الدین زور اسی نقطہ نظر کے قائل نظر آتے ہیں کہ مصنف کا مرکزی اسلوب ایک ہی ہوتا ہے البتہ موضوع و مواد کے مطابق انداز، پیرایہ یا''رنگ سخن''بدل سکتا ہے یا بدل جاتا ہے؛ مثلاً سرسید(۱۸۱۷ء۔۱۸۹۸ء) کے بارے میں لکھتے ہیں:

ہر ایک (مضمون) کو اُسی پیرائے میں لکھتے تھے جو اس کے لیے مناسب ہوتا[7]۔

بعض اوقات محی الدین زور اس موقعے کے لیے جہاں لفظ پیرایہ یا رنگ استعمال کرنا چاہیے، وہاں لفظ اسلوب بھی استعمال کر جاتے ہیں؛ مثلاً لکھتے ہیں کہ

سرسید کی طرح حالی(۱۸۳۷ء۔۱۹۱۴ء) ، ہرمضمون کو اس کے مناسب اسلوب بیان میں ادا کرتے ہیں۔[8]

حال آں کہ عبارت میں لہجوں یا رنگوں کے تنوع کو قطعاً اسالیب کی افراط قرار نہیں دیا جاسکتا۔ گویا کوئی جانا پہچانا مصنف صاحب افکار تو ہوسکتا ہے لیکن صاحب اسالیب نہیں۔

اسی طرح کی کیفیت اردو کے ایک اور نقاد اور مورخ حامد حسن قادری(۱۸۸۷ء۔۱۹۶۴ء) کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ حامد حسن قادری اپنی تصنیف داستانِ تاریخِ اُردو (۱۹۴۱ء) میں خاصی حد تک نثری اسلوب کے پارکھ نظر آتے ہیں لیکن بعض مقامات پر وہ بھی ایک مصنف کے یہاں کئی اسالیب کی موجودگی کی بات کر جاتے ہیں ؛مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:

سرسید کو حسبِ موقع جدید اسالیب بیان پیدا کرنے کا..... خاص ملکہ حاصل تھا[9]۔

یا مولوی غلام امام شہید (وفات:۱۸۷۶ء) کے بارے میں لکھتے ہیں:

ایجادِ اسالیب .....کے بہتر سے بہتر نمونے شہید کی نثر میں ملتے ہیں[10]۔

یا غالب(۱۷۹۷ء۔۱۸۶۹ء) کے بارے میں لکھتے ہیں:

نو بہ نو اسلوبوں.....نے غالب کے خطوط میں..... دل کشی ..... پیدا کر دی ہے[11]۔

اب اردو نثر کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ سرسید، مولوی غلام امام شہید اور مرزا غالب کا اسلوب منفرد اور متعین ہے اور ہم سب پر ظاہر ہے ؛ مثلاً سرسید نے قدیم طرز تحریر کو آہستہ آہستہ خیر باد کہہ کے ایک ایسے معروضی، استدلالی اور قطعیت سے مملو نثر کی جانب پیش قدمی کی، یا یوں کہہ لیجیے کہ اسے اپنے باطن سے برآمد ہونے کا موقع دیا، جو موضوع کے مطابق مختلف پیرایوں اور رنگوں کو اپنے تصرف میں لانے کی سکت رکھتا تھا۔ حامد حسن قادری اور کچھ دیگر ناقدین ان رنگوں اور پیرایوں کو

اسالیب کا تنوع سمجھے اور اسلوبی تنقید کے مختلف دھاگوں کو الجھا بیٹھے۔

اسی نوعیت کی کیفیت رشید احمد صدیقی (۱۸۹۲ء۔۱۹۷۷ء) کی تنقید نثر میں ہے۔ رشید احمد صدیقی کا ''تصورِ اسلوب'' متوازن، صائب اور سائنسی ہے لیکن بعض اَوقات اُن کی کفایت لفظی (اور اسی طرح بعض اوقات ان کی طول کلامی) مسائل پیدا کر دیتی ہے ،مثلاً ایک مقام پر لکھتے ہیں:

> نظم میں توازن،اسالیب کی تکرار پر ہوتا ہے، نثر میں اسالیب کے تنوّع پر [۱۲]۔

حقیقت یہ ہے کہ نظم میں بھی شاعر کا جو اسلوب جھلکتا ہے، وہ تو بنیادی طور پر ایک ہی ہوتا ہے، البتہ شاعر نظم کے آہنگ کی خاطر لسانی پیرایے کی ساخت کو حالتِ ارتعاش میں ضرور رکھتا ہے؛ رشید احمد صدیقی اس ارتعاش کو''اسالیب کی تکرار'' قرار دے رہے ہیں۔ اسی طرح نثر نگار، اپنے موضوع و مواد کی وسعت و گہرائی اور فکر و احساس کی پرت اندر پرت دنیاؤں کے باعث جس لسانی و بیانی رنگا رنگی کا مظاہرہ کرتا ہے، رشید احمد صدیقی اسے ''اسالیب کا تنوّع'' قرار دیتے ہیں۔ کسی ایک تخلیق کار کے متعین اور مشخص اسلوب کے لیے''اسالیب کی تکرار'' یا ''اسالیب کا تنوّع'' ایسے الفاظ استعمال کرنا اصل میں اسلوب شناسی کے عمل کو راہِ راست سے ہٹانے کا عمل ہے۔

کچھ ناقدین کا رویہ اس حوالے سے قطعاً ابہام زدہ یا کنفیوزڈ (confused) نہیں ہے۔مثلاً مولانا صلاح الدین احمد (۱۹۰۲ء۔۱۹۶۴ء) نے ایک مقام پر میرا جی (۱۹۱۲ء۔۱۹۴۹ء) کے حوالے سے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ:

> میرا جی کے ترجمے کی سب سے دل آویز خصوصیت یہ ہے کہ وہ موضوع کے مطابق اپنی زبان بدل لیتے ہیں، اگرچہ اسلوب نہیں بدلتے [۱۳]۔

گو یہ بات میرا جی کے منظوم تراجم کے حوالے سے کہی گئی ہے لیکن اس سے نثر کے حوالے سے بھی زیر بحث موضوع پر ہماری رہنمائی ہو رہی ہے ۔میرا جی کی نثر کا منفرد زاویہ اور لسانی تجربہ بھی مولانا صلاح الدین احمد کی نظروں سے پوشیدہ نہیں تھا؛ لکھتے ہیں:

> وہ اپنی نوع کا واحد صاحبِ طرز نثر نگار ہے جو نہ صرف بیک وقت اعلیٰ درجے کی فارسی آمیز اور ہندی آموز نثر دِل کشا لکھنے پر قادر ہے بلکہ جس کی نثر کا ہر ٹکڑا اُس کی شخصیت اور اُس کے اندازِ خیال کی پوری غمازی کرتا ہے [۱۴]۔

مولانا صلاح الدین احمد شخصیت اور اندازِ خیال کی جس غمازی کی بات کر رہے ہیں، وہ اسلوب واحد ہی کی عطا ہو سکتا ہے۔

ایسی ہی بات عبدالقیوم (پ: ۱۹۲۵ء) نے بھی اپنے مبسوط مقالے حالی کی اردو نثر نگاری (۱۹۶۴ء) میں کہی ہے:

ایک اچھے نثر نگار کا یہ بھی فرض ہے ...... کہ جس طرح انسان کی فطرت میں مختلف اوقات میں مختلف کیفیتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں اور جذبات میں اُتار چڑھاؤ، پستی و بلندی ہوتی ہے، وہ اُن کیفیات کو ملحوظ رکھے اور خوشی اور رنج و ملال کی حالت کے بیان کرنے میں پیرایۂ بیان حسبِ حال اختیار کرے[۱۵]۔

''پیرایۂ بیان کی تبدیلی'' سے عبدالقیوم کی مراد صاحبِ طرز نثر نگار کے حقیقی اور بنیادی اسلوب کی تبدیلی نہیں ہے، یہ مقتضائے حال کے مطابق زبان و بیان کے رنگوں میں کمی بیشی ہے۔

جمیل جالبی کا عمومی نقطہ نظر بھی یہی ہے۔ سید رستم علی بجنوری (قیاسی: ۱۷۳۰ء-۱۸۰۰ء) کی تصنیف قصہ و احوالِ روہیلہ (۱۹۸۹ء) کے حوالے سے لکھتے ہیں:

قصہ و احوالِ روہیلہ کی نثر طبع زاد ہے جس میں اظہارِ بیان کا تنوّع بھی ہے۔ موقع و محل کے مطابق جیسے تاریخی منظر بدلتا جاتا ہے، اس کا اسلوب بھی اُسی کے مطابق اپنا لہجہ اور رُخ بدلتا جاتا ہے[۱۶]۔

جمیل جالبی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ہر قابلِ ذکر اسلوب میں لچک کا عنصر بھی فراوانی سے موجود ہوتا ہے؛ صاحبِ اسلوب کی تخلیقی ذہانت اور تنقیدی شعور نے یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ خیال، احساس، مشاہدہ اور واردات، اپنے اظہار کے لیے کس موقع پر کیا پیرایہ اختیار کریں؛ سو جمیل جالبی نے مختلف نثر نگاروں کے ہاں ''موضوع کی مناسبت سے طرزِ ادا میں تبدیلی'' کو نشان زد کیا ہے؛ مثلاً محمد باقر آگاہ ایلوری (۱۷۴۵ء-۱۸۰۵ء) کی نثر کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

صرف فنی مباحث اور موضوع کی مناسبت سے طرزِ ادا میں تبدیلی آئی ہے[۱۷]۔

جمیل جالبی نے ''موضوع کی مناسبت سے طرزِ ادا میں تبدیلی'' کی یہ بات شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی (قیاسی تاریخ: ۱۷۲۰ء-۱۷۹۰ء) کی تفسیر مرادیہ (۱۸۴۹ء) کے حوالے سے بھی کی ہے کہ:

تفسیر مرادیہ میں اظہارِ بیان کی اکتا دینے والی یکسانیت پیدا نہیں ہوتی اور اندازِ بیان موضوع کی مناسبت سے بدل کر تنوّع کا اثر پیدا کرتا ہے[۱۸]۔

لیکن بعض اوقات جمیل جالبی مذکورہ بالا ''تنوّع'' یا ''طرزِ ادا میں تبدیلی'' یا ''متغیر پیرایۂ بیان'' کا تذکرہ و تجزیہ کرتے ہوئے اس کیفیتِ اسلوب کو مصنف کا ''دوسرا اسلوب'' قرار دے دیتے ہیں بلکہ کچھ نثر نگاروں کے ہاں ''تین اسالیب'' کی موجودگی کا بھی اشارہ کر دیتے ہیں؛ اصل میں یہی وہ مقامات ہیں، جہاں اختلاف کا زاویہ ابھرتا ہے۔ واضح رہے کہ جمیل جالبی ہر مقام پر کسی صاحبِ اسلوب کے ہاں دو یا تین اسالیب کے موجود ہونے کی بات نہیں کرتے، عمومی طور

پر انھوں نے اس ''کیفیتِ اسلوب'' کے اظہار کے لیے اسلوب میں دو رنگوں یا دو دھاروں یا دو رجحانات کے الفاظ استعمال کیے ہیں ؛ صرف چند مقامات ایسے ہیں جہاں جمیل جالبی نے دو یا تین اَسالیب کی بات کی ہے؛ مثلاً کربل کتھا (۱۹۶۵ء) کے بارے میں لکھتے ہیں:

کربل کتھا میں دو اَسالیب ملتے ہیں[۱۹]۔

نو طرز مرصع (۱۹۷۵ء) کے بارے میں تو جمیل جالبی اس سے بھی آگے بڑھ گئے، فرمایا:

نو طرز مرصع میں ہمیں تین اسالیب ملتے ہیں[۲۰]۔

لیکن یہ جمیل جالبی کا عمومی انداز نہیں ہے، عموماً وہ اس کیفیت کو زبان و بیان کے دو یا تین رنگ یا دھارے یا رجحانات کہتے ہیں، جیسا کہ اٹھارویں صدی کی ایک تصنیف جذبِ عشق (۱۸۵۲ء) از سید حسین شاہ حقیقت (۱۷۷۲ء۔۱۸۴۳ء) کے حوالے سے کہا گیا ہے:

جذبِ عشق کی نثر میں رُجحانات کے دو دھارے ساتھ ساتھ بہتے ہیں[۲۱]۔

جذبِ عشق کی نثر کے اِن دو دھاروں کی وضاحت آگے چل کر جمیل جالبی یہ کرتے ہیں:

اس نثر میں دو مختلف رجحانات ایک ساتھ چل رہے ہیں۔ ایک وہ رجحان جس کی نمائندگی نو طرز مرصع کرتی ہے اور دوسرا وہ رجحان جس کی نمائندگی عجائب القصص (۱۹۶۵ء) کرتی ہے[۲۲]۔

گویا یہاں یہ نہیں کہا جا رہا کہ جذبِ عشق میں دو اسلوب ملتے ہیں۔ فسانۂ عجائب (۱۸۲۴ء) کے بارے میں بھی جمیل جالبی نے یہی بات کہی ہے :

اگر سارے فسانۂ عجائب کو پڑھا جائے تو یہ اسلوبِ بیان دو رنگوں میں سامنے آتا ہے[۲۳]۔

لیکن اگلے ہی جملے میں اسلوب کے دوسرے رنگ کو دوسرا اسلوبِ بیان بھی کہہ دیا ہے۔

اگر اس ایک نکتے سے صرفِ نظر کر لیا جائے تو مجموعی طور پر جمیل جالبی کا تصوّرِ اسلوب خاصا جامع، بسیط اور جدید نظر آتا ہے۔

مذکورہ بحث کے تناظر میں رشید حسن خان اور مولانا صلاح الدین احمد کی طرح وزیر آغا بھی اسلوبِ واحد کے قائل نظر آتے ہیں ۔وزیر آغا کا تصورِ اسلوب نہایت واضح ہے۔ اُن کے نزدیک نثر کی یکسانیت دُور کرنے کے لیے اسلوب میں تغیر، تلوّن اور تنوّع ضروری ہیں؛ عموماً یہ عناصر ہر اچھے اسلوب کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوتے ہیں۔ بعض اَوقات نثر

(خصوصاً افسانوی نثر) میں دو لہجوں، رنگوں، دھاروں یا دو سے زائد لسانی پیرایوں کی موجودگی ایک الگ نوعیت کا ذائقہ پیدا کر دیتی ہے؛ وزیر آغا ایسے اَنداز کو نثر کے لیے نیک شگون سمجھتے ہیں لیکن وہ کبھی بھی کسی صاحبِ اسلوب کے یہاں دو لہجوں یا دو رنگوں یا دو دھاروں کو ''دو اسلوب'' نہیں کہتے۔ مثلاً انتظار حسین (۱۹۲۵ء۔۲۰۱۶ء) کے ناول تذکرہ (۱۹۸۷ء) میں متغیر رنگوں کی نمود کا مشاہدہ وزیر آغا ان لفظوں میں پیش کرتے ہیں:

بہت کم ناولوں میں ایسی شعبدہ گری دیکھنے کو ملتی ہے جیسی تذکرہ میں کہ مصنف جب چاہتا ہے، اپنے قاری کو ایک جگہ سے دوسری جگہ اور ایک زمانے سے دوسرے زمانے میں پہنچا دیتا ہے۔...... دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ انتظار حسین جب ایک زمانے سے دوسرے زمانے میں جاتے ہیں تو ان کی گفتگو کا انداز اور لہجہ بھی تبدیل ہو جاتا ہے...... قدیم زمانے کی آہستہ روی اور جدید دور کی تیز رفتاری کو زبان کے دو مختلف پیرایوں کی مدد سے گرفت میں لے کر اور پھر ان پیرایوں کو یکے بعد دیگرے برت کر انتظار حسین نے ناول کے ایک نئے اسلوب کی طرح ڈالی ہے[۲۴]۔

(غور فرمائیے کہ انتظار حسین کے حوالے سے بہ آسانی یہ کہا جاسکتا تھا کہ انتظار حسین دو یا دو سے زائد اسالیب کے مالک ہیں۔)

اس سے مختلف بلکہ متضاد رائے کی بھی ایک مثال دیکھیے، اسالیب نثر کے ایک پارکھ اسلوب احمد انصاری (۱۹۲۵ء۔۲۰۱۶ء) اپنے واضح تصور اسلوب اور تہ دار تجزیۂ اسلوب کے باوجود یہ رائے پیش کر دیتے ہیں کہ:

بعض شاعر یا ادیب ایک ہی اسٹائل کے پابند نہیں ہوتے بلکہ ان کے اسٹائل کے رنگ گو نا گوں ہوتے ہیں...... مثلاً ہمیں شیکسپیئر (William Shakespeare۔ ۱۵۶۴ء۔۱۶۱۶ء) کے ڈراموں میں اُس کے مختلف شعری اسالیب کی جلوہ گری نظر آتی ہے...... لہٰذا ہم یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ شیکسپیئر کا بس ایک واحد اسٹائل ہے[۲۵]۔

اس رائے کو نزاعی ہی کہا جاسکتا ہے؛ اصل میں صحیح اور صائب بات اسلوب احمد انصاری نے درج بالا سطروں میں خود ہی لکھ دی ہے کہ بعض کے ''اسٹائل کے رنگ گو نا گوں ہوتے ہیں۔'' لیکن ایک ہی سانس میں اسلوب کے ان رنگوں کو ''اسالیب'' بھی قرار دے دیا ہے۔

مرزا خلیل احمد بیگ (پ: ۱۹۴۵ء) اسلوبیات کی توضیح اور اردو فن پاروں کے اسلوبیاتی تجزیے (یعنی سائنسی و لسانیاتی حوالے سے مطالعۂ اسلوب) میں مہارت رکھتے ہیں لیکن وہ بھی کہیں کہیں کسی ایک صاحبِ اسلوب مصنف کو کئی اسالیب کا مالک و مختار قرار دے دیتے ہیں۔[۲۶] حالانکہ مرزا خلیل احمد بیگ اصل حقیقت سے بخوبی واقف ہیں اور اسلوب کے لسانی و بیانی تغیر کی مختلف جگہوں پر نشان دہی بھی کرتے ہیں اور اسے ''زبان میں تباین'' (variation in language)[۲۷] قرار دیتے ہیں، یہ بھی فرماتے ہیں کہ:

> زبان میں تباین (variation) علاقائی سطح پر بھی پایا جاتا ہے اور سماجی و انفرادی سطح پر بھی۔ علاوہ ازیں موقع و محل (situations) کے لحاظ سے بھی زبان میں تباین پیدا ہو جاتا ہے۔ اسلوب اپنے خاص مفہوم میں ادبی زبان میں تباین سے سروکار رکھتا ہے[۲۸]۔

اسی طرح ایک اور ناقد منظر عباس نقوی (پ: ۱۹۳۳ء) کی یہ بات تو بالکل درست ہے کہ:

> شخصیات کا تنوع ہی اسالیب کے تنوع کا سبب ہوتا ہے[۲۹]۔

لیکن بعض اوقات منظر عباس نقوی بھی کچھ ایسا تاثر چھوڑتے ہیں جس سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک مصنف کے یہاں کئی اسالیب کی کارفرمائی دیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے صراحتاً اس نقطۂ نظر کو تو پیش نہیں کیا؛ البتہ ان کی کئی عبارتوں سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ کچھ مصنفین کو صاحبِ اسلوب کے بجائے ''صاحبِ اسالیب'' کہہ رہے ہیں؛ مثلاً غالب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> اردو نثر کی خوش نصیبی کہیے کہ مکاتیبِ غالب میں موضوعات کا ایسا تنوّع ہے کہ ان میں ادائے خیالات اور اظہارِ احساسات کے تمام اسالیب بڑی آسانی سے تلاش کیے جا سکتے ہیں[۳۰]۔

پھر منظر عباس نقوی نے ان ''اسالیب'' کو خود تلاش کیا اور اسلوبِ غالب کے مختلف عناصر مثلاً توضیح، بیانیہ، انانیت وغیرہ کو اوصاف کہنے کے بجائے اسالیب قرار دے دیا اور یہ نتیجہ پیش کیا کہ:

> غرض خطوط غالب (۱۹۴۱ء) میں ہمیں ہر طرح کے اسالیب مل سکتے ہیں[۳۱]۔

مذکورہ بالا خیالات کا اظہار انھوں نے اپنے جس مضمون میں کیا ہے، اس کا نام ''خطوطِ غالب کا اسلوبیاتی مطالعہ'' رکھا ہے حالانکہ اس کا نام ''خطوطِ غالب کا اسلوبی مطالعہ'' یا پھر ''غالب کا نثری اسلوب'' ہونا چاہیے تھا کیونکہ منظر عباس نقوی کا مضمون ''اسلوبیات'' کے حوالے سے نہیں ہے، انھوں نے ادبی تنقید کے زاویے سے اسلوبِ غالب کو دیکھا اور اپنے نتائج فکر کو پیش کیا ہے۔

طارق سعید نے بھی اپنی کتاب اسلوب اور اسلوبیات (۱۹۹۶ء) میں ''نثر کے عناصر'' کو ''اسالیب'' قرار دیا ہے۔ مشرق و مغرب کے نقادوں نے اسلوب کی جس بھی خوبی یا انفرادیت یا مزاج یا خد و خال کا ذکر کیا ہے، طارق سعید نے اُسے اسلوب کی قسم یا شاخ قرار دے دیا ہے؛ بعدازاں وہ کوئی اکیس اسالیب کی ایک فہرست مرتب کر دیتے ہیں؛ ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیتے ہیں کہ یہ ''متنازعہ فیہ قسمیں'' ہیں؛ فہرست ملاحظہ ہو:

تعقیدی اسلوب، مذہبی اسلوب، مقفیٰ، مسجع، مرجز اسلوب، تمثیلی حکایتی اسلوب، رنگین مرصع اسلوب، محاوراتی اسلوب، بنیادی اسلوب، سپاٹ و سادہ اسلوب، بیانیہ اسلوب، توضیحی اسلوب، انانیتی اسلوب، شگفتہ یا تاثراتی اسلوب، طنزیہ یا ظرافت آمیز اسلوب، خطیبانہ اسلوب، حکیمانہ فلسفیانہ اسلوب، مرقع نگاری یا محاکاتی اسلوب، استعاراتی اسلوب، اسلوبِ جلیل، علامتی اسلوب، ہیجانی، ماورائی یا منتشر خیالی کا شکستہ اسلوب، اِمتزاجی اسلوب[۳۲]۔

واضح رہے کہ اِس فہرست کے اِندراج سے پہلے وہ ایک مقام پر لکھ آئے ہیں کہ:

افلاطون کے مطابق مجموعی یا اِمتزاجی اسلوب ہی سب سے اہم اور قابل مطالعہ ہے[۳۳]۔

بہتر تو یہی تھا کہ وہ ''مجموعی یا اِمتزاجی اسلوب'' ہی کو موضوع بناتے اَور اِس طرح وہ جدید تصوّرِ اسلوب کے قریب آ جاتے لیکن انھوں نے اِس کے بجائے اکیس اسالیب کی فہرست مرتب کر ڈالی؛ صرف یہی نہیں، غالب کی نثر میں تو ''ستر فی صد اسالیب'' کی موجودگی کا اعلامیہ بھی جاری کر دیا (اس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا)۔ درج بالا فہرست میں ''تمثیلی حکایتی اسلوب'' کا بھی ذکر ہے اور ''محاکاتی اسلوب'' کا بھی لیکن آگے چل کر فاضل مصنف نے منظر اعظمی (۱۹۳۴ء۔۱۹۹۷ء) کے موقف کو اپنی تائید کے ساتھ درج کیا ہے کہ:

تمثیل نگاری اسلوب کے بجائے ایک صنعت ہے[۳۴]۔

گویا تمثیل کو فہرست اسالیب میں اسلوب کا درجہ دینے کے بعد اصل بات کا احساس ہوتا ہے، سو اُسے بالآخر اسلوب کی ایک صنعت کہ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک جگہ طارق سعید خاصی متوازن رائے ظاہر کرتے ہیں کہ:

ہر عالمانہ یا دعائیہ اسلوب خود کوئی اسلوب نہ ہو کر تشکیل اسلوب میں محض ایک جز کی طرح استعمال ہو سکتے ہیں[۳۵]۔

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ:

کوئی موضوع یا جزوِ زبان خود اسلوب ہونے کا دعوے دار ہو جائے[۳۶]۔

لیکن دوسری جانب فہرستِ اسالیب مرتب کرتے ہوئے اجزائے زبان و بیان (محاورہ، قافیہ، سجع، ترصیع، رنگینی، استعارہ، علامت وغیرہ) اور اجزائے موضوع و مواد (مذہب، فلسفہ، حکمت، اِسی طرح تخیل کی کارفرمائی، خیال کا بکھراؤ یا طنز و ظرافت کی فراوانی وغیرہ) کو ''اسالیب'' قرار دے دیتے ہیں۔

آگے چل کر وہ اِس صورتِ حال پر خود ہی کہہ اٹھتے ہیں کہ:

اسالیب کی مذکورہ اِکیس قسمیں مزید قطع و برید کی حاجت مند ہیں[۳۷]۔

اور پھر واقعی قطع و برید کر کے اکیس اقسام کو چودہ اقسام تک لے آتے ہیں ۔[۳۸] چودہ اقسا م اسالیب پر مبنی یہ فہرست بھی چوں کہ کوئی ٹھوس منطقی جواز نہیں رکھتی، لہٰذا فہرست مختصر کر کے نو اقسام تک لائی جاتی ہے اور پھر نو قسموں کو دو قسموں تک پہنچا دیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اسلوب دو طرح کے ہوتے ہیں: 'اسلوب جلیل، اور 'اسلوب جمیل'؛ گویا اکیس انواعِ اسالیب کا تصور سمٹتے سمٹتے دو کے ہندسے کو چھو لیتا ہے[۳۹]۔

اگر فاضل مصنف، اسلوب کی دو قسموں (جمیل و جلیل) کو ایک ہی قرار دے کر اُسے ''مجموعی اسلوب'' یا ''امتزاجی اسلوب'' (یا فقط اسلوب) کہہ دیتے تو ان کے موقف اور ان کی عبارت کا سارا الجھاؤ یک لخت ختم ہو جاتا (''مجموعی اسلوب'' اور ''امتزاجی اسلوب'' کے الفاظ انھوں نے کئی مقامات پر استعمال بھی کیے ہیں)۔

اسی طرح کا معاملہ طارق سعید، مرزا غالب کے ساتھ بھی کرتے ہیں ، پہلے غالب کے اردو خطوط میں ستر فی صد اسالیب کی اطلاع دیتے ہیں ، چند کے نام بھی بتاتے ہیں اور پھر یہ بھی لکھ دیتے ہیں کہ :

> دراصل امتزاجی اسلوب کی رونمائی غالب کے ہاتھوں سے ہوئی ہے اور بالآخر جلوۂ عام بنی[۴۰]۔

گویا طارق سعید کے یہاں بات اِدھر اُدھر گھوم کر وہیں پہنچی کہ اصل میں کسی مصنف کا اسلوب ایک ہی ہوتا ہے؛ طارق سعید کے لفظوں میں اسے ''امتزاجی اسلوب'' کہہ لیجیے؛ اور ایسا کہنے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے کہ ہر اہم اور اعلیٰ اسلوب ''امتزاجی'' ہی ہوتا ہے کہ اس کی بنت میں اجزائے زبان و بیان اور اجزائے موضوع و مواد کے متنوع رنگ اور متموج آہنگ بڑی خاموشی اور نفاست سے شامل ہوئے ہوتے ہیں۔

اسی بات کی گواہی اسلم انصاری (پ: ۱۹۴۰ء) کا مضمون ''چودھری افضل حق (۱۸۹۱ء۔۱۹۴۲ء) کی زندگی کا اسلوب'' دے رہا ہے ؛ یہ مضمون کئی حوالوں سے اہم ہے خصوصاً اس زاویے سے کہ زندگی کی نثر مرصع بھی ہے اور سادہ بھی، صحافیانہ بھی ہے اور خطیبانہ بھی۔ وہ نقاد جو ایک صاحبِ اسلوب مصنف کے یہاں اسلوب کے متنوّع رنگ دیکھ کر اسے کئی اسالیب کا مالک و مختار کہہ دیتے ہیں، زندگی کو دیکھ کر چودھری افضل حق کو بھی کم از کم ''تین اسالیب'' کا مالک کہہ سکتے ہیں لیکن اسلم انصاری ان عناصر کو تین رنگ اور آہنگ قرار دیتے ہیں؛ وہ لکھتے ہیں:

> زندگی کی نثر تین بنیادی آہنگ رکھتی ہے؛ یعنی نثرِ مرصع.....سادہ تر واقعاتی محاکات.....خطیبانہ آہنگ[۴۱]۔

صاحب اسلوب افسانہ نگار اور خوش فکر نقاد نیر مسعود (۱۹۳۶ء۔۲۰۱۷ء) نے اپنے ممدوح میرزا رجب علی بیگ

سرور(۱۷۸۲ء۔۱۸۶۹ء) کو صاحبِ اسلوب کے بجائے صاحب اسالیب قرار دے کے اپنے مداحین کے لیے ایک مشکل کھڑی کر دی ہے؛ گو ان کے مضمون ''رجب علی بیگ سرور کے نثری اسالیب'' میں سے عنوان اور دو چار جملے ہٹا دیے جائیں تو سارا مضمون رجب علی بیگ سرور کے اسلوب واحد ہی کی جانب اشارہ کر رہا ہے؛ مضمون میں سے چند جملے ملاحظہ ہوں:

> سرور کا عمومی اسلوب اگرچہ انشا پردازانہ ہے لیکن یہ انشا پردازی زیادہ تر ہم قافیہ جملوں اور کچھ لفظی رعایتوں، خصوصاً ابہام کے استعمال تک محدود رہتی ہے[۴۲]۔
>
> داستان کے مختلف اجزا کی تمہید میں وہ ''رنگینی عبارت کے واسطے دقت طلبی'' کرتے نظر آتے ہیں[۴۳]۔
>
> موضوعات کی طرح ان کی نثر میں بھی تنوع ہے[۴۴]۔
>
> اس گفتگو سے ..... رجب علی بیگ سرور کی نثر کے تنوع کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے[۴۵]۔
>
> زیادہ تر سرور بیان میں اپنے تاثرات اور جذباتی ردعمل کا اظہار کرتے چلتے ہیں۔ تاریخ نویسی میں بھی وہ اس روش کو برقرار رکھتے ہیں[۴۶]۔
>
> سرور کے اسلوب نثر کے سلسلے میں ان کے خطوں کا جائزہ علیحدہ مضمون کا طالب ہے[۴۷]۔
>
> انشائے سرور کے کچھ خطوں میں سرور نے ایسا بے تکلف اور رواں اسلوب اختیار کیا ہے کہ غالب کی طرح مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے[۴۸]۔

گویا نیر مسعود، میرزا رجب علی بیگ سرور کے حقیقی اسلوب کے مختلف رنگوں، زاویوں اور تیوروں ہی کو پیش کر رہے ہیں اور کوئی ایسی دلیل سامنے نہیں لا رہے، جس سے ثابت ہو کہ سرور کی دسترس میں ایک سے زیادہ اسالیب تھے جو وہ حسب موقع اور حسب خواہش باری باری برتتے تھے، اور ان تمام اسالیب کا الگ الگ تعین کیا جاسکتا ہے یا ان کے تشخص کی علیحدہ علیحدہ نشان دہی کی جاسکتی ہے۔ نیر مسعود کے مضمون سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ سرور کے یہاں موضوع و مواد، الفاظ اور پیرایہ اظہار کا تنوع ہے، وہ عبارت کے آغاز میں ''رنگینی عبارت کے واسطے دقت طلبی'' کرتے ہیں، باقی عبارت خاصی حد تک سادہ، رواں، بے تکلف اور پرلطف رکھتے ہیں۔ اس ''دقت طلبی'' کو ظاہر ہے ایک الگ اسلوب نہیں کہا جاسکتا، نہ ہی نیر مسعود نے اسے دوٹوک انداز میں ایک الگ اسلوب کہا ہے۔ نیر مسعود کے مضمون سے داخلی شہادت یہی مل رہی ہے کہ اسلوب ہی شخصیت ہے اور حقیقی اور مرکزی اسلوب ایک ہی ہوتا ہے۔

نیر مسعود کا اسلوبی تجزیہ مکمل، گہرا اور قابل داد ہے، البتہ رجب علی بیگ سرور کی نثر کے بدلتے رنگوں، تیوروں،

لہجوں اور قرینوں کو دیکھ کر کئی اسالیب کی موجودگی کا اعلان ،خود ان کے تصورِ اسلوب، عبارتِ مضمون اور پیش کردہ اقتباسات سے مطابقت نہیں رکھتا۔

صاحبِ اسلوب یا ''صاحبِ اسالیب'' کی اِس بحث کا حاصل یہ ہے کہ شاعر یا نثر نگار کا حقیقی اسلوب تو ایک ہی ہوتا ہے، البتہ موضوع و مواد، داخلی کیفیت اور اقتضائے حال کے مطابق اس اسلوب سے مختلف النوع رنگ و آہنگ پھوٹنے لگتے ہیں جنھیں اسلوب کے رنگ، رجحان، دھارے یا شرارے کہنا زیادہ بہتر ہے؛ یہ ہرگز کسی ایک ادیب یا شاعر کے ''اسالیب'' نہیں؛ یہ اس کے مرکزی، حقیقی اور اصلی اسلوب کی کچھ مرتعش صورتیں ہوتی ہیں اور یہ صورتیں شاعر و ادیب کی تخلیقی قوّت اور اس کے ذہن و ذوق کی تازگی اور بالیدگی کی غماز ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

* (پ: ۱۹۶۵ء)، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہء اُردو، گورنمنٹ اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ، لاہور۔

۱۔ جمیل جالبی، تاریخ ادب اُردو (جلد دوم) (لاہور: مجلس ترقی اَدب، بارششم، ۲۰۰۹ء)، ۱۰۱۹۔

۲۔ اسی تناظر میں سلیم آغا قزلباش کہتے ہیں کہ اسلوب'' کوئی جامد چیز نہیں ہے'' بلکہ:

یہ ایک ارتقائی عمل سے عبارت ہے۔ جیسے جیسے تجربات، مشاہدات اَور مطالعے میں اِضافہ ہوتا ہے، اسلوب میں بھی اُسی نسبت سے گہرائی، نکھار اور جامعیت در آتی ہے، بلکہ ایک لحاظ سے اسلوب کا ارتقائی سفر، سفرِ حیات کے مماثل ہے۔''

[سلیم آغا قزلباش، جدید اردو افسانے کے رُجحانات (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۰ء)، ۵۳۹۔]

۳۔ رشید حسن خان، تفہیم (نئی دہلی: مکتبۂ جامعہ، قومی کونسل برائے فروغِ اُردو، ۲۰۱۲ء)، ۱۰۔

۴۔ وزیر آغا، تنقید اور جدید اُردو تنقید، (کراچی: انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۹۸۹ء)، ۲۴۴۔

۵۔ ایضاً، ۹۳۔

۶۔ ایضاً، ۱۶۶۔

۷۔ سید محی الدین قادری زور، اُردو کے اسالیب بیان (لاہور: مکتبۂ معین الادب، ۱۹۶۲ء)، ۳۹-۴۰۔

۸۔ ایضاً، ۴۵۔

۹۔ حامد حسن قادری، داستان تاریخ اردو، (آگرہ: لکشمی نرائن اگروال تاجر کتب، ۱۹۴۱ء)، ۳۲۹۔

۱۰۔ ایضاً، ۲۵۲۔

۱۱۔ ایضاً، ۲۴۶۔

۱۲۔ رشید احمد صدیقی، ''اردو نثر کا بنیادی اسلوب''، مشمولہ تنقیدی مقالات (حصہ نثر)، مرتب میرزا ادیب (لاہور: لاہور اکیڈمی، ۱۹۶۵ء)، ۹۰۔

۱۳۔ مولانا صلاح الدین احمد، میرا جی کے چند منظوم تراجم، مشمولہ ادبی دنیا، (لاہور: اپریل ۱۹۵۵ء)، ۳۵۔

۱۴۔ صلاح الدین احمد، میرا جی کی نثر، مشمولہ: ادبی دنیا، (لاہور: جنوری ۱۹۵۴ء)، ۲۸۔

۱۵۔ عبدالقیوم، حالی کی اُردو نثر نگاری (لاہور: مجلس ترقی ادب، بار اوّل، ۱۹۶۴ء)، ۲۶۸۔

۱۶۔ جمیل جالبی، تاریخِ اَدبِ اُردو (جلد دوم)، (لاہور: مجلس ترقی اَدب، بار ششم، ۲۰۰۹ء)، ۱۰۷۷-۱۰۷۹۔

۱۷۔ ایضاً، ۱۰۱۹۔

۱۸۔ ایضاً، ۱۰۴۷۔

۱۹۔ ایضاً، ۹۹۰۔

۲۰۔ ایضاً، ۹۹۵۔

۲۱۔ ایضاً، ۱۱۲۵۔

۲۲۔ ایضاً، ۱۱۲۷۔

۲۳۔ جمیل جالبی، تاریخِ ادبِ اُردو (جلد سوم)، (لاہور: مجلس ترقی ادب، بار دوم، ۲۰۰۸ء)، ۶۳۵۔

۲۴۔ وزیر آغا، ساختیات اور سائنس (لاہور: مکتبہ فکر و خیال، ۱۹۹۱ء)، ۱۰۷۔

۲۵۔ اسلوب احمد انصاری، نظری تنقید: مسائل و مباحث، مرتبہ عفت آرا (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۱۱ء)، ۱۸۱-۱۸۲۔

۲۶۔ مرزا خلیل احمد بیگ، ''معاصر اُردو افسانہ اور اسلوب''، مشمولہ مخزن، نمبر ۲۵، مدیر تحسین فراقی (لاہور: قائدِ اعظم لائبریری، ۲۰۱۳ء)، ۱۴۔

۲۷۔ ایضاً، ۹۔

۲۸۔ ایضاً، ۹۔

۲۹۔ منظر عباس نقوی، نثر، نظم اور شعر (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۸ء)، ۴۱-۴۲۔

۳۰۔ ایضاً، ۲۹۔

۳۱۔ ایضاً، ۴۰۔

۳۲۔ طارق سعید، اسلوب اور اسلوبیات (لاہور: نگارشات، ۱۹۹۸ء)، ۳۵۴-۳۵۵۔

۳۳۔ ایضاً، ۳۵۱۔

۳۴۔ ایضاً، ۳۵۹۔

۳۵۔ ایضاً، ۳۷۰۔

۳۶۔ ایضاً، ۳۷۰۔

۳۷۔ ایضاً، ۳۷۰۔

۳۸۔ ایضاً، ۳۷۱۔

۳۹۔ ایضاً، ۳۷۱-۳۷۲۔

۴۰۔ ایضاً، ۳۸۳۔

۴۱۔ اسلم انصاری، ادبیاتِ عالم میں سیر افلاک کی روایت (لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۶ء)، ۲۳۸۔

۴۲۔ نیر مسعود، ''رجب علی بیگ سرور کے نثری اسالیب''، مشمولہ منتخب مضامین از نیر مسعود (کراچی: آج پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء)، ۱۲۷۔

۴۳۔ ایضاً، ۱۲۶۔

۴۴۔ ایضاً، ۱۲۶۔

۴۵۔ ایضاً، ۱۳۷۔

۴۶۔ ایضاً، ۱۲۹۔

۴۷۔ ایضاً، ۱۳۳۔

۴۸۔ ایضاً، ۱۳۳ - ۱۳۴۔

مآخذ

احمد، صلاح الدین۔ ''میرا جی کی نثر''۔ مشمولہ: ادبی دنیا۔ لاہور: جنوری ۱۹۵۴ء۔

احمد، صلاح الدین۔ ''میرا جی کے چند منظوم تراجم''۔ مشمولہ ادبی دنیا۔ لاہور: اپریل ۱۹۵۵ء۔

اسلم انصاری۔ ادبیاتِ عالم میں سیر افلاک کی روایت۔ لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۶ء۔

انصاری، اسلوب احمد۔ نظری تنقید: مسائل و مباحث۔ مرتبہ عفت آرا۔ نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۱۱ء۔

بیگ، مرزا خلیل احمد۔ ''معاصر اُردو اَفسانہ اَور اسلوب''۔ مشمولہ مخزن، نمبر ۲۵۔ مدیر تحسین فراقی۔ لاہور: قائدِ اعظم لائبریری، ۲۰۱۳ء۔

جمیل جالبی۔ تاریخِ ادبِ اُردو (جلد دوم)۔ لاہور: مجلس ترقی ادب۔ بار ششم، ۲۰۰۹ء۔

جمیل جالبی۔ تاریخِ ادبِ اُردو (جلد سوم)۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، بار دوم، ۲۰۰۸ء۔

خان، رشید حسن۔ تفہیم۔ نئی دہلی: مکتبۂ جامعہ، قومی کونسل برائے فروغِ اُردو، ۲۰۱۲ء۔

صدیقی، رشید احمد۔ ''اردو نثر کا بنیادی اسلوب''۔ مشمولہ تنقیدی مقالات (حصہ نثر)۔ مرتب میرزا ادیب۔ لاہور: لاہور اکیڈمی، ۱۹۶۵ء۔

طارق سعید۔ اسلوب اور اسلوبیات۔ لاہور: نگارشات، ۱۹۹۸ء۔

عبدالقیوم۔ حالی کی اُردو نثر نگاری۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، بار اوّل، ۱۹۶۴ء۔

قزلباش، سلیم آغا۔ جدید اُردو اَفسانے کے رُجحانات۔ کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۰ء۔

نقوی، منظر عباس۔ نثر، نظم اور شعر۔ علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۸ء۔

نیر مسعود۔ ''رجب علی بیگ سرور کے نثری اسالیب''، مشمولہ منتخب مضامین از نیر مسعود۔ کراچی: آج پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء۔ ۱۲۷۔

وزیر آغا۔ تنقید اور جدید اُردو تنقید۔ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۹ء۔